• فیض اکبر خان

اکبر حمیدی اور مجلہ ''اوراق''

Akbar Hameedi and Mujalla "Auraq"

Akbar Hameedi was imminent Urdu writer of his time. His prose and poetic writings were influencial and impressive. He had actively participated in National integrity, soliderity movements in Urdu literature. All forms of Prose like Afsana, Inshaiya, Symbolism and Travelog were appreciated by Urdu readers. In poetry, Ghazal, Nazm, Blank Verse, Haiku etc. were technically treated by Akbar Hameedi. His criticism is also impartial and based on realism, facts and proper intellect. His letter to Editor "Auraq" enlightened Urdu fiction and poetry.

اکبر حمیدی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سیرت و کردار کا مرقع، مرنجان مرنج طبیعت، غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں صداقت، خلوص شیفتگی و شگفتگی عیاں نہ ہو۔ اُن کی تصانیف (۲۳ کے لگ بھگ ہیں) جو اہل علم و ادب کو دعوت فکر دے رہی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی متاعِ زیست کا حصہ ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اُن کے خطوط جو مدیرِ ''اوراق'' کے نام تحریر ہوئے اُن کی روشنی میں تنقیدی بصیرت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادب کے فروغ اور تفہیمِ ادب کے سلسلے میں اُن کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہا ہے۔ ہڈسن نے کہا تھا ادب زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا منطقی اظہار یہ ہے، یہ بات اکبر حمیدی پر صادق آتی ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، تنقید، نظم اور غزل کے وہ مردِ میدان ہیں۔

جدید نظم میں ابلاغ کی ضرورت ہو یا افسانے کا علامتی انداز، وہ ہر جگہ اور ہر صورت کمربستہ نظر آتے ہیں۔ ''اوراق'' کے وہ مستقل قاری ہیں اور مجلہ ''اوراق'' میں خطوط بھی بھرپور انداز میں لکھتے رہے ہیں۔ اُن کا اسلوبِ بیان بے لاگ، سادہ اور گھٹا ہوا ہے۔ تنقید کے موضوع پر ان کے مضامین اہلِ نقد کے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں۔ مجلہ ''اوراق'' کے مدیر کے نام انھوں نے چالیس (۴۰) خطوط لکھے۔ ان میں تنقیدی بصیرت، بلند خیالی، مضامین کا تنوع اور تنقید کے منصب کی پاسداری جابجا نظر آتی ہے۔ ان کے بقول ادیب کو معاشرے میں ایک فعال کردار ادا کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ قومی بے راہ روی، حالتِ اضطراب اور جنگی حالات میں بھی قوم کو صحیح سمت میں راہنمائی فراہم کرنا ادیب کی اولین ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ وہ خود مثال پیش کرتے ہیں کہ ویتنام کی جنگ میں امریکی ادیبوں اور دانشوروں نے امریکہ کو موردِ الزام ٹھہرایا اور اس کے خلاف نظمیں لکھیں تو بالآخر

• صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، گوجرانوالہ۔ faizakbar20@gmail.com

امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یہی حال جنگ ۱۹۶۵ء میں بھی ہوا۔ ہند و پاک کے ادیبوں نے ملی نغموں میں عوامی جذبات کو ایک نئی ترنگ اور آہنگ دیا۔ جس کی وجہ سے جذبۂ حب الوطنی کے فروغ ملا۔ قومی فکر بیدار ہوئی۔ اکبر حمیدی رقم طراز ہیں :

"ادبی پلیٹ فارم کو زیادہ موٴثر بنانے کے لیے ہمیں عوامی ادب تخلیق کرنا ہوگا۔ عوام میں تعلیم و تربیت کی کمی کے باعث ادب اپنی پوری قوت سے اثرانداز نہیں ہورہاہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یا تو ہم عوام کو ذہنی طور پر اتنا بلند کریں کہ وہ ادب کی تخلیقی سطح کے ساتھ آ لگیں یا ادیب اپنی زبان اور اپنے اندازِ بیان کو عوامی سطح سے قریب تر لے آئیں۔"[۱]

ادیب کی موٴثر آواز اسی صورت، نفوذ پذیری کر سکتی ہے۔ جب عوام اس کی تخلیقات کو سمجھیں اور ان پر سر دھنیں۔ ابلاغ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے ایک جگہ لکھا ہے: "جدید شعرا اپنی علمی دھاک بٹھانے کے لیے مشکل الفاظ اور انگریز قلم کاروں کی کوڑی لاتے ہیں تاکہ خدا کرے کہ کوئی نہ سمجھے۔ اگر لکھنے والے اس پر آمادہ ہو جائیں کہ ادب کو عوام کے لیے لکھنا ہے تو امریکی عوام کی طرح برصغیر کی عوام بھی جنگ کے خلاف احتجاج کریں اور جلوس نکالیں۔ اس طرح عوام کے حوصلوں اور امنگوں کا مرکز سیاسی نہیں ادبی پلیٹ فارم ہو۔" اکبر حمیدی اس جذبے کے قائل ہیں کہ :

"ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب انتہائی قابلِ رحم ہے۔ ہمارے ادیب دو راز کار علامات، بعید از قیاس تجریدیت اور نہایت ادق اصطلاحات کا استعمال کر رہے ہیں اور اسے اپنی علمی دھاک بٹھانے کے لیے ضروری سمجھ بیٹھے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ریڈیو جیسے عوامی ذریعۂ ابلاغ پر بھی جب ادیب و شاعر کسی ادبی بحث میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہاں بھی ایسی ہی ناقابلِ فہم اصطلاحات میں گفتگو ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادب سے قاری کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور وہ اسے سمجھنا اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اپنی خو بدلنے پر تیار نہیں تو قاری سے ادب نہ پڑھنے کا شکوہ کیا معنی رکھتا ہے۔"[۲]

قدامت اور جدت میں مغائرت یقینی امر ہے۔ قدما کو ہمیشہ یہ فکر لاحق رہی ہے کہ جدید نسل تساہل پسندی اور عجلت میں اُن فکری رویوں اور تہذیبی پاسداریوں کی حفاظت نہیں کر پائے گی جن کے وہ صدیوں سے امین ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی نسل کس ڈگر پہ رواں دواں ہے۔ اکبر حمیدی کے خیال میں کہ :

"نئی نسل کی شاعری کوئی اضطراری کیفیت نہیں بلکہ شعوری عمل اور ردِ عمل کی تصویر ہے۔ وہ حقیقت اور خواب کے سنگم پر کھڑی ہے۔ وہ اگر ایک طرف موجود کی الم نگار ہے تو دوسری طرف مستقبل کے خوابوں سے بھی رشتہ قائم رکھے ہوئے ہے مگر نہ موجود کی الم نگاری کو یاسیت پسندی قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے خوابوں کو محض رجائیت پسندی!"[۳]

صبح سے شام تلک اپنا لہو بیچتا ہوں — سرخیال ڈھونڈ رہا ہوں تیرے گالوں کے لیے — شہزاد احمد
تیرا رفیق سفر ہوں میں دیوتا تو نہیں — تو میرے قدموں کی دھول اپنی آنکھ سے نہ لگا — عارف عبدالمتین
وہ پھول خود سے خفا تو بہت ہوا ہو گا — صبا کے پاؤں میں کانٹا جسے چھونا پڑا — تخت سنگھ

جدید شاعری جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے نئے خون کی متقاضی ہے۔ چنانچہ اکبر حمیدی رقم طراز ہیں :

> ''اب نیچر سادگی کا دور نہیں انسان کی پُرکاری کا عہد ہے اور یہ پُرکاری ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو چکی ہے۔ اس پُرکاری کی نمایندگی اس جدید اُردو پُرکاری کا شاعر کر سکتا ہے۔ اس پُرکاری کی لپیٹ میں نہ صرف ہماری خارجیت آچکی ہے بلکہ ہماری داخلی زندگی، ہماری ذات کی داخلیت بھی اس کی آغوش میں سما چکی ہے۔ انسانی نفسیات جس قدر آج پیچیدہ ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی ہمارے آج کے علوم و فنون جس قدر پُرکاری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔'' ۴

علامت نگاری جدید دور کا ایک انمول تحفہ ہے۔ جب شاعر کو اظہار کا کوئی واضح پیمانہ نظر نہیں آتا تو وہ علامت کے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ اکبر حمیدی اس بارے میں لکھتے ہیں :

> ''پتہ نہیں میں نے اسٹائل کا لفظ درست جگہ پر استعمال کیا ہے یا نہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہر بار کسی ایک لفظ کو علامت بنا کر اس کے گرد ایک سی فضا تان دینا تخلیقی عمل کے تسلسل کو رد کر دے گا۔ میرے خیال میں فن کار اپنے تخلیقی عمل سے ایک دنیا تخلیق کرتا ہے۔ کچھ روز قیام کرتا ہے۔ جب اس دنیا کے امکانات ختم ہونے لگتے ہیں تو وہ خود ہی اس دنیا کو مسمار کر کے اپنے عملِ تخلیق سے ایک نئی دنیا معرضِ وجود میں لے آتا ہے۔'' ۵

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہ خیر القرونی قرنی کے مصداق نئی نسل یاسیت پسندی کی طرف رجحان رکھتی ہے یا مغربی افکار کے زیرِ اثر نئی راہیں متعین کرنے کی تگ و دو میں ہے۔ مکتوب نگار یہاں بھی اپنی رائے دینے سے باز نہیں آئے۔ ان کے بقول :

> ''آیا نئی نسل بزرگوں کے تتبع میں یاسیت پسندی کو قبول کر رہی ہے یا مغربی ادب میں مروجہ یاسیت پسندی کے سامنے ہتھیار ڈال رہی ہے؟۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمارے شاعروں نے جو بھی اندازِ فکر اپنایا ہے اس کا ذہنی پسِ منظر پیش کیا جاتا۔ اس طرح ہم یاسیت پسندی یا رجائیت پسندی سے بلند ہو کر اپنے ادبی شہ پاروں کا بہتر تجزیہ کر سکتے۔ موجودہ صورت میں بحث روایتی سی اور محدود سی ہو کر رہ گئی ہے۔'' ۶

برے حال اس کی گلی میں ہیں میرؔ — جو اُٹھ جائیں یاں سے تو اچھا کریں
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

نئی نسل عصری تقاضوں سے کس طرح بہرہ مند ہے اور کس طرح سے اپنی ذمہ داری بطریقِ احسن ادا کر رہی ہے۔

اس کا اندازہ مکتوب نگار کی اس رائے سے ہوتا ہے :

"کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ نئی نسل اس دنیا کی مخلوق ہے جس کی جغرافیائی حدیں ٹوٹ چکی ہیں اور جس کی سرحدیں اب زہرہ و مشتری سے جا ملی ہیں۔ نئی نسل کا شعوری اُفق ابھر کر بیکراں ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کے دکھ درد بھی لا متناہی اور غیر محدود دکھوں کی صدائے باز گشت ہیں اور اسی لا متناہیت نے نئی نسل کو بزرگوں سے زیادہ ذمہ دار بنا دیا ہے۔" ۷

اکبر حمیدی انشائیہ کے خدو خال متعین کرنے میں وزیر آغا کے شانہ بشانہ کام کرتے رہے۔ انشائیہ کیا ہے؟ اس کی معنویت کیا ہے؟ اکبر حمیدی کے قلم سے بہت سے مضامین انشائیے کے نقوش ثبت کرنے میں ممد ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ :

"انشائیہ کو، میں نثری غزل سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ انشائیہ کو اتنی بلند سطح پر لیے جا رہے ہیں کہ بعد میں آنے والوں کے لیے بڑی مشکل ہو گی۔" ۸

"اوراق" نے جہاں دوسری اصنافِ ادب کو مقبول و معتبر بنانے کے لیے اُردو ادب میں بھرپور کردار ادا کیا ہے وہاں انشائیہ جیسی صنفِ نثر کو نہ صرف قارئین تک پہنچایا ہے بلکہ اس صنف کو بڑے زوروں سے منوایا بھی ہے اور یہ خدمت اس پرچے کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہر سوئی کی اس ریاضت کے نتیجے کے طور پر اس صنف کو اب اس کے مخالفین نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔

ہمارے انشائیہ نگار بڑے ہی بلند حوصلہ ہیں کہ انھوں نے برسوں طوفانی فیصلوں کا سامنا کیا مگر ٹھنڈے دل سے صبر و استقامت کے ساتھ اس صنف کی آبیاری کرتے رہے اور آخر کار اُردو ادب میں ایک خوب صورت صنفِ نثر کا اضافہ کرنے میں کام یاب ہوئے۔

انشایئے اور مضمون میں تفریق کے بارے میں بہت سی آرا دی گئیں، لیکن انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو تازہ کاری کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں :

"انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔" ۹

یہ رجحان قابلِ ستائش تو نہیں لیکن قابلِ غور ضرور ہے۔ کیونکہ جس صنف پہ توجہ دی جاتی ہے۔ وہ صنف تو مقبولیت کی منازل طے کر جاتی ہے لیکن جن اصناف پر توجہ کم ہو جاتی ہے وہ بھی معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً :

"انشائیہ نگار، انشائیہ کے بارے میں، افسانہ نگار افسانہ کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ ایک شاعر ایسا ہے جو ہر بار غزلوں کے علاوہ "اوراق" کے افسانوں، انشائیوں اور دوسری اصناف نثر پر بھی طبع آزمائی کر رہا ہے۔

شاید نثر نگار دوستوں نے شاعری پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ حالانکہ اچھی نثر اچھی شاعری کے بغیر ممکن نہیں۔ دراصل ہمارے عہد میں اب ہو یہ رہا ہے کہ سوائے چند ایک سر پھروں کے باقی سب لکھنے والے صرف اپنی اپنی صنف کی نگارشات پڑھ رہے ہیں اور باقی وقت کسی بہتر کام میں صرف فرما رہے ہیں۔"۱۰

"اوراق" کی یہ کوشش رہی ہے ہر گذرے سال کے ادب کو تنقیدی نگاہ سے پرکھے اور سال گذشتہ کے ادبی منظر نامے کا تفصیلی شذرہ ترتیب دے، مزید یہ کہ کسی ایک ادبی صنف کے بارے میں تفصیلی بحث بھی قارئین کی نظر کرے۔ اس دفعہ ۱۹۸۰ء کے ادبی جائزے کو اکبر حمیدی عمیق نگاہ سے دیکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"۱۹۸۰ء کا اُردو ادب انور سدید کا اچھا جائزہ ہے۔ انھوں نے خوب شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور بہت حد تک ذاتیات سے بلند ہو کر لکھا ہے۔ ممکن ہے اس میں بھی اختلاف کی گنجائش ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی ذاتی پسند و ناپسند کا جو سانچہ بنا رکھا تھا۔ اسے توڑنے کی بھرپور کوشش ضروری کی تھی۔ ذاتی سانچے کو توڑنا خود اپنی ذات کو توڑنے کے مترادف ہوتا ہے۔ بہر حال یہ جائزہ قابل داد ہے۔"۱۱

اس سال کے ہر پرچے میں کوئی نہ کوئی انشائیہ یا اس پر بحث موجود ہے۔ بہت سی نوزائیدہ اصناف تو حریفوں کے ایک ہی وار کا شکار ہو چکی ہیں مگر انشائیہ میں اتنی زندگی اور توانائی اور امکانات ہیں کہ تنقید و تنقیص کے ہر وار کے بعد اس کا سر پہلے سے زیادہ بلند نظر آیا۔ اب تو انشائیہ نگاروں کی نئی نسل تیار ہو چکی ہے۔ اور بہت سے نئے انشائیہ نگار رسائل کے دروازوں پر دستکیں دے رہے ہیں۔

بعض انشائیے اور انشائیہ نگار ایسے بھی ہیں جن میں معنی کی دریافت کا رجحان غالب ہے۔ نامعلوم کو معلوم کے دائرے میں لانے کے لیے انشائیہ نگار نے اعلیٰ ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۔ حامد برگی نے اُستاد ذوق کے مشہور شعر :

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر　　　آرام میں وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

کو موضوع بنایا ہے اور کہا ہے آرام میں دراصل وہ ہے جو تکلف سے کام نہیں لیتا ہے، لکھتے ہیں :

" اخلاق و شائستگی ایک دو طرفہ عمل ہے جس میں ہر شخص کو دوسرے سے اس اخلاق و شائستگی کی توقع رکھنی چاہیے جو وہ خود دوسرے سے برتتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص سے تکلف سے پیش آیئے اور دوسرے سے یہی تکلف کی توقع رکھیے۔"۱۲

حامد برگی نے موضوع کو اُلٹا پلٹا ہے اور بہت سی نئی باتیں سامنے لائے ہیں۔...

مدیر کے نام ایک مکتوب میں اکبر حمیدی اشتراک عمل کے ساتھ ساتھ مصلح کا فرض بھی انجام دیتے محسوس ہوتے ہیں۔

"اوراق" کے زیرِ مطالعہ انشائیوں میں ایک بات قطعی مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان میں کسی انشائیہ نگار نے انشائیہ میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں ذاتی طور پر انشائیہ کا مزاح سے کوئی علاقہ نہیں سمجھتا۔ میں اسے ایک فلسفیانہ اندازِ نظر رکھنے والی صنفِ ادب سمجھتا ہوں جس میں انشائیہ نگار غیر مقالاتی اسلوب بیان میں موضوع پر جولانیِ فکر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مزاح بلکہ کوئی عنصر بھی بحیثیت عنصر کے انشائیے کا شجر ممنوعہ نہیں مگر مزاح یا طنز کی باقاعدہ شرکت انشائیہ کی گہرائی اور رفعت کو مجروح کرے گی... آخر میں صرف ایک بات اور... بعض حضرات صنفِ انشائیہ سے بحیثیت صنف کے ہی انکار کر رہے ہیں۔ یہ بات اُس وسعت نظری کے منافی ہے جو علم ہمیں عطا کرتا ہے۔ صنف تو کوئی بھی بری یا اچھی نہیں۔ اس صنف میں تخلیقات اچھی یا بری ہو سکتی ہیں سو اپنی رائے صرف تخلیقات پر دینی چاہیے۔"۱۳

انشائیہ اب باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس صنف کی مقبولیت اور نفوذ پزیری میں مجلہ اوراق کی کوششوں کو تحسینی انداز کی صورت یاد رکھا جائے گا۔ اب جس طرح دوسری اصنافِ ادب کی ریڈیو پر مانگ ہے اُس طرح ریڈیو والے باقاعدہ انشائیہ لکھواتے ہیں اور اپنے پروگراموں میں نشر کرتے ہیں۔

ایک خط میں اکبر حمیدی انشائیہ کا تقابل غزل سے کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"انشائیہ کو میں اس لیے نثری غزل کہتا ہوں کہ یہ غزل کی طرح مشکل الفاظ سے بدمزہ ہو جاتا ہے۔ دونوں اصناف میں فکر، جذبہ، ہیئت اور تجربہ کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان اور اس میں شعری آہنگ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"۱۴

مزید یہ کہ:

"اوراق" کے انشائیہ نمبر کو میں پاکستان میں شائع ہونے والا پہلا انشائیہ نمبر کہوں گا۔ ساڑھے تین سو صفحات کا یہ انشائیہ نمبر اُردو ادب کی تاریخ میں حقیقی معنوں میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اس نمبر میں شائع دو مذاکرے انشائیہ کے موضوع پر تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس نمبر میں شائع ہونے والے تمام قدیم و جدید انشائیوں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ کے بارے میں کی گئی تعریف کو قبولِ عام کی سند حاصل ہو چکی ہے۔ سو انشائیہ کیا ہے؟ کے نام سے اُڑائی ہوئی گرد ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی ہے۔ محمد رضا کاظمی نے بتایا کہ انشائیہ کا مزاح نگاری سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک فکری اور فلسفیانہ صنف ہے۔ راغب شکیب نے اسے خود انکشافی اور تخلیقی عمل کا میٹھا پھل قرار دیا ہے۔ شہزاد منظر نے ایک نہایت عمدہ بات کہی کہ انشائیہ کو محض حصولِ مسرت کا ذریعہ کہنا اس کی توہین ہے۔ اس میں فلسفیانہ افکار اور سماجی تنقید کو بھی جگہ دینی ہو گی۔ سماجی تنقید کے حوالے سے صنفِ انشائیہ پر بہت اعتراضات ہوئے ہیں۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کر ادھر شہزاد منظر اُصولی طور پر سماجی تنقید کو انشائیہ کے لیے ضروری قرار دے رہے ہیں

اور اُدھر اسی شمارہ میں سلیم آغا صفحہ ۸۱، ۸۲ اور ۸۳ پر مطبوعہ انشائیوں میں سے سماجی تنقید کی مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ یہ انشایئے پڑھ کر مجھے محترم غلام جیلانی اصغر کی بات کا قائل ہونا پڑا کہ اُردو انشائیہ انگریزی انشائیہ سے آگے نکل جائے گا مگر ڈاکٹر صاحب مجھے اجازت دیجیے یہ عرض کرنے کی کہ اُردو انشائیہ انگریزی انشائیہ سے آگے نکل چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ ''اوراق'' کے انشائیہ نمبر میں انگریزی انشائیوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں اور تراجم کتنے بھی اعلیٰ درجے کے ہوں ان میں اصل کی شان پیدا نہیں ہوتی لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ تراجم میں زبان و بیان ہی متاثر ہوتے ہیں۔ خیالات و افکار تو دوسری زبان میں ڈھل جاتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ خیالات و افکار کے اعتبار سے بھی یورپی انشائیہ اُردو انشائیہ سے پیچھے ہے۔''۱۵؎

ایک خط میں وہ انشایئے کو کسی معیار پر لے جانے کے خواہاں ہیں؟، وضاحت فرماتے ہیں :

''میں طنز و مزاح کو انشائیہ کے معیار کی چیز نہیں سمجھتا اور میرا خیال ہے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا لیکن انشائیہ کے بارے میں ایک غلط فہمی عرصے سے پھیلی ہوئی تھی جس میں بیکن وغیرہ کا بھی کچھ دخل ہے لیکن اُردو انشایئے نے اپنے آغاز میں ہی اس عنصر کو مسترد کر کے اپنا قبلہ درست کر لیا ہے۔ ایک عرصے تک کہا جاتا رہا ہے کہ انشائیہ ''آوارہ خیالی'' یا ''افکارِ پریشاں'' کی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ بات غیر معقول ہے کہ کسی بھی ادب پارے کے بارے میں جو ہمیشہ ایک صحت مند ذہن، موضوع پر کڑی نظر رکھنے والے تخلیق کار کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہوتی ہے، ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ یہ ساری غلط فہمیاں انشایئے کے بارے میں Loose Sally of Mind یا Dispersed Meditation جیسی تعریفوں کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں۔ انشائیہ نگار تو اُس پرندے کی طرح ہوتا ہے جو انتہائی بلند پروازی کرتے وقت بھی اپنی دور رس نگاہ اپنے آشیانے پر مرکوز رکھتا ہے جہاں اُسے لوٹ کر آنا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ انشایئے کے ذریعے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اُس نے انشایئے کے لیے ایک عنوان یا موضوع مقرر کر رکھا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ موضوع کو چھوڑ کر دور چلا جائے۔ پروفیسر سجاد نقوی نے انشائیہ کے سلسلے میں ایک اور خوب صورت بات کہی ہے کہ ''انشائیہ اسلوب کی تازگی اور خیال کی تازگی کے خوشگوار سنجوگ کا نام ہے۔'' اور ''انشائیہ تخلیقی زبان میں جذبے، فکر کیفیت، کے نامعلوم گوشوں کو معلوم میں لانے کا نام ہے۔'' ۱۶؎

انشائی ادب کا نمونہ تو غالب کے خطوط بھی ہیں اور سر سید، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، ابوالکلام آزاد اور پطرس بخاری کی تحریریں بھی انشائی ادب کا نمونہ ہیں۔ پھر یہ سوال کہ آج انشائیہ کا آغاز کیوں، قابلِ غور ہے۔ اکبر حمیدی ''اوراق'' کے انشائیوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے ان الفاظ میں دے رہے ہیں کہ :

''اوراق'' کے انشائیوں کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ فی الحال بلاشبہ سینئر لکھنے والوں کے انشایئے جونیئر انشائیہ نگاروں سے بہتر ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ آیندہ پانچ سال تک جونیئر لکھنے والے سینئر لکھنے والوں سے آگے نکل جائیں گے۔'' ۱۷؎

یہ ایک اچھی روایت ہو گی اسی وجہ سے اکبر حمیدی انشائیہ کے مستقبل کے بارے میں پُر اُمید ہیں اور لکھتے ہیں کہ :

''یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آج کا دور انشائیہ کا دور ہے یعنی علم و دانش کا۔آیندہ صرف وہی تخلیقی نثر زندہ رہے گی جو انشائیے کے اس عنصر کو جذب کرے گی۔'' ۱۸

انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے کہ جس کے ذریعے فکر کی بالیدگی اور جہانِ تازہ کی نمو ممکن ہے۔اکبر حمیدیؔ کے خیال میں انشائیہ نگار غیر معمولی موضوعات کو نہایت صحت مند انداز میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔مثال کے طور پر :

''گھاس'' جو ایک حد درجہ معمولی اور پیش پاُافتادہ چیز سمجھی جاتی ہے مگر انشائیہ نگار نے گھاس کے حوالے سے تخلیق کائنات کے بارے میں کتنی گہری باتیں اپنے مخصوص انشائی اسلوب میں کہہ دی ہیں۔ پھر نفسِ انسانی کے کیسے کیسے حقائق کی غواصی کی ہے۔ذرا یہ سطریں دیکھیے: ''گھاس تو خواہش کی طرح ہے جسے دبایا تو جا سکتا ہے مگر اسے مارا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اسی لیے سیانوں نے کہا ہے کہ خواہش کو مارنے کی کوشش نہ کرو، اسے سُدھا کر اس سے کام لو''۔ وجہ یہ ہے کہ خواہش ایک قوت کا نام ہے۔انسان نے اس دُنیا میں جو حیرت ناک کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ اسی قوت کی بدولت ہیں۔اگر اس کے دل میں خواہشیں پیدا نہ ہوتیں تو ان کی تکمیل کے لیے جو جد وجہد اُس نے کی ہے وہ کیوں کر کرتا۔اگر اسے ختم کرنا ممکن ہوتا تو ہزاروں برس کے قوانین، امر و نہی کے احکامات اور تعلیم و تدریس اور تربیت کے جملہ میلانات کی مدد سے انسان نے کبھی کا اسے زیر کر لیا ہوتا۔'' ہم نے کب سوچا تھا کہ زمین کے اس نفسِ امارہ (گھاس بشمول اجناس) ہی کی بدولت سب جاندار انسان سمیت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دیکھیے ایک پیش پاُافتاد چیز ''گھاس'' ہی پر تو دراصل ساری زندگی کا انحصار ہے۔ یہی ایک انشائیہ نگار کا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک انتہائی معمولی چیز کے کس قدر غیر معمولی پن کو ظاہر کر دیا جس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' ۱۹

سلیم آغا کا انشائیہ ''گرہ'' اس کا پہلا ہی جملہ دیکھیے :

''ہر وجود ایک گتھی ہوئی گرہ ہے جو وقت آنے پر کھل جاتی ہے اور یوں اس میں مقید تمام عناصر دوبارہ زمین کا رزق بن جاتے ہیں تاکہ کسی دوسری نوع کی گرہ کو جنم دے سکیں''۔۲۰

مختصر یہ کہ انشائیہ خیال، علم، دانش کی ایسی لطیف صنفِ ادب ہے جو فکر کے نئے پن سے ہمیں چونکا رہی ہے۔ انشائیہ معمولی چیزوں کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔اس لیے جمہوری صنفِ ادب ہے۔ یہی باتیں اس کی بے پناہ مقبولیت کا باعث بن رہی ہیں۔

انشائیہ نگار انسانی جذبوں، غم اور خوشی کے منبع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فلسفیانہ لب و لہجہ میں گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔اکبر حمیدی نے اس کیفیت کو حامد برگی کے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے :

''حامد برگی نے ''ہنسی'' کے نام سے جو انشائیہ لکھا ہے اس میں اپنے مخصوص اسٹائل کو بحال رکھا ہے اور شوپنہار کے برعکس ہنسی کو دائمی انسانی کیفیت قرار دیا ہے۔ یہ ایک نیا انداز فکر ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غم انسانی مزاج کا حصہ نہیں بلکہ ہنسی اور خوشی انسانی مزاج کا فطری حصہ ہیں۔ غم تو باہر سے آتا ہے جبکہ خوشی اندر سے پھوٹتی ہے جس کا سرچشمہ انسانی فکر اور جذبہ ہے۔''۲۱

اکبر حمیدی درج ذیل الفاظ میں انشائیہ نگاری اور زندگی کی وابستگی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''انشائیہ کسی قدر زندگی سے جڑا ہوا ہے اور زندگی...... کی گوناں گوں کیفیات سے کس قدر لطف اندوز بھی کرتا ہے۔ ''اوراق'' کے خطوط سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انشائیوں کے بارے میں تجزیاتی انداز پیدا ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ انشائیہ نگاروں میں اپنے طور پر بھی مقابلے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔''۲۲

اکبر حمیدی تمام نثری اور شعری اصناف پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''اوراق'' نے جہاں کئی اور تحریکیں چلائیں، وہاں ادب میں دوہری معنویت یا معنویت کی تہہ داری کی تحریک بھی چلائی...... میں دیکھتا ہوں کہ غزل میں جو سماجی موضوعات کے اشعار آرہے ہیں ان میں تہہ داری کی جھلک واضح ہے۔ جہاں تک میں ''اوراق'' کے اس موقف کو سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ ''اوراق'' سماجی موضوعات پر لکھنے کے خلاف نہیں ہے، یہ مجلہ ایک پرت کی ''شفاف'' شاعری کے خلاف ہے جس میں معنویتِ بعید واضح ہو۔ معنویت کی تہہ داری، ثانویت میں لطف کو دوبالا کر دیتی ہے اور اس سے نہ صرف کسی کو انکار نہیں رہا بلکہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اب غزل میں تہہ در تہہ مضامین کی کثرت ہونے لگی ہے۔ غزل نے ہر دور کی مثبت تحریکوں کو قبول کر کے ایک نیا روپ اختیار کیا ہے جو اس عہد کا تقاضا تھا مگر تہہ داری اور معنویت میں ایک سے زائد معنوں کی جھلک ''اوراق'' کی ایک نہایت زندہ تحریک ہے جس نے ادب کو نئی زندگی دی ہے۔ ''اوراق'' شاعری میں روایتی لفظیات سے انحراف کی بھی ایک خاموش تحریک چلا رہا ہے، اُمید ہے اسے بھی پذیرائی حاصل ہو گی۔'' ۲۳

جدید دور کے مسائل بھی جدت تفکر کے پروردہ ہیں، اس لیے سوچوں کا تلاطم اضطرابی اور ہیجانی کیف پر منتج ہوتا ہے۔ مکتوب نگار آشوب کائنات اور آشوب ذات کے مسائل کا ادراک رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سوچیں چونکہ جدید عہد کے ان گنت مسائل کی پیدا کردہ ہیں، اس لیے نئی ہیں۔ ان نئی سوچوں کے اظہار کے لیے زیرِ نظر غزلوں کے شعراء نے لفظیات اور تلازمات کا ایک نیا نظام بھی تخلیق کیا ہے جو ہماری روایت سے مختلف ہو گیا ہے اور جس کا رنگ، خوشبو ذائقہ بھی غزل سے مختلف ہے۔ اس طرح میں محسوس کر رہا ہوں کہ ''اوراق'' نئی حیات سے بھرپور نئے عہد کی غزل کی نشوونما کا کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا رہا ہے چند مثالیں :

پھر کون یہ اندر آگیا ہے　　　دروازہ تو بند کر چکا ہوں

اختر ہوشیارپوری

روح سے روح ہو چکی بد ظن　　　جسم سے جسم کب جدا ہو گا

بلراج کومل

کون جانے اس کی اپنی پیاس کا عالم ہو گیا　　　وہ جو میری روح کو پیاسا سمندر کر گیا

حیدر قریشی

''اوراق'' نے ادب میں اور خصوصاً شاعری میں دوہری معنویت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا اب اس کے اثرات تمام ادبی جرائد میں شائع ہونے والی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہوا ہے کہ بعض شعرا دوہری معنویت تخلیق کرنے کی کوشش میں مبہم ہو گئے یا عجز بیان کا شکار ہو گئے یا شعریت کی کمی کا نمونہ بن کر رہ گئے، میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سب کی طرح شاعری میں حتیٰ کہ عصری معاملات و مسائل کی شاعری میں بھی ایک سے زیادہ معنویت کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ اب شاعری بہت حساس میڈیم ہے۔ خصوصاً غزل بہت نازک کام کی چیز ہے جو ایک غیر موزوں لفظ کو بھی برداشت نہیں کرتی۔

مزید رائے کا اظہار اس معصوم سی خواہش سے یوں ہو رہا ہے:

> ''مجھے کئی دفعہ خیال آیا ہے کہ کاش ہمارا کوئی ادارہ ایسی ایک کمیٹی بنائے جو غزل کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے مضامین کے ذریعے اپنے عہد کے علمی اور عصری معاملات کا احاطہ کر لے۔ میرا خیال ہے شاید ہی کوئی رنگ اور کوئی موضوع ایسا ہو گا جو غزل کی فضائے بسیط سے باہر رہ گیا ہو۔ یوں اس ایک صنف کے ذریعے انسانی تاریخ کے اَن گنت گوشے تخلیقی صورت میں دیکھے جا سکیں گے۔ موضوعات کے علاوہ غزل کے کئی طرح کے رنگ ڈھنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔''۲۴

اکبر حمیدی آزاد نظم کی ماہیت اور تکنیک سے بخوبی آگاہ ہیں، اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> آزاد نظم میں ہیئت کے جو تجربے کیے گئے اُن کی وجہ سے نظم کی تفہیم و تعبیر آسان ہو گئی۔ کئی لوگوں کے لیے یہ مشق کا میدان ٹھہرا اور کئی لوگوں کے لیے یہ فکر کی انوکھی آماجگاہ رہی۔ ''اوراق'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ''پہلا ورق'' اور ڈاکٹر حنیف کیفی کا مضمون ''آزاد نظم کی ہیئت اور تکنیک'' خاصے کی چیز ہیں۔ آزاد نظم کو آگے بڑھانے میں یہ مضامین مؤثر کردار ادا کریں گے۔ یہ دونوں مضامین مل کر دراصل ایک ہی مضمون بنتا ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ آپ نے آزاد نظم کے موجودہ مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور ڈاکٹر حنیف کیفی نے آزاد نظم کا پورا ہیئتی تناظر ہماری آنکھوں میں منعکس کر دیا ہے۔ آپ کا یہ کہنا ہے کہ آزاد نظم کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اُس کے ہیئتی امکانات سے باخبر ہو بہت بڑی صداقت ہے اور اس صداقت کے شعور ہی سے آزاد نظم کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔''۲۵

نظریہ ٔ قومیت اور وطنیت پر قدما نے اپنے جذبات کا اظہار والہانہ عقیدت سے کیا ہے۔ حالیؔ تک آتے آتے یہ جذبہ کچھ ماند پڑ گیا لیکن جدید شعرا نے اسے یکسر فراموش کر دیا۔ اکبر حمیدی کے بقول :

> ''ولیؔ، میرؔ اور حالیؔ نے جس طرح دِلی کا ذکر کیا ہے۔ اب آزادی کے بعد اس جذبے میں کمی کیوں آگئی ہے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم سے وطنیت کا احساس چھن گیا ہے۔ یا ہم نظریاتی ترجیحات کا شکار ہو گئے ہیں؟''
>
> ۲۶

نثری نظم دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک مخصوص آہنگ رکھتی ہے۔ شاعری کا آہنگ کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ مقبول صنف بھی ہے۔

ہر انسان کی زندگی کے معیارات مختلف ہیں۔ ترجیحات وقت کے ساتھ ساتھ ترمیمات کا شکار ہوتی ہیں۔ خود نوشت اُن لوگوں کی قابلِ تقلید ہے جو ہمارے معاشرے میں سانس لیتے ہیں۔ معاشرتی نشیب و فراز سے ہمکنار ہوتے ہیں اور اپنے غم کو آفاقیت کا رنگ دے کر ہمارے رُوبرو پیش کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی خود نوشت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے رقم طراز ہیں :

> ''اصل میں ہم اب تک اُن لوگوں کی خود نوشتیں پڑھتے رہے ہیں جو ہمارے طبقہ میں سے نہیں تھے۔ ان کے مسائل ہمارے مسائل نہیں تھے ان کی دل چسپیاں، ان کی خوشیاں اور غم اور ان کی دنیا میں ہم سے بہت مختلف قسم کی چیزیں تھیں۔ ہمیں ایسے خود نوشت کی سوانح چاہیے جو ہم میں سے ہوتا تاکہ وہ ہماری دنیا کی باتیں کرتا۔'' ۲۷

اسی طرح یاد نگاری تاریخ کا ایک اہم جزو ہے۔ انسان اپنی یادوں کے سہارے ماضی کے بہت سے حالات و واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جن کا ادراک مؤرخین کو نہیں ہوتا۔ ایک مکتوب میں اکبر حمیدی، غلام الثقلین نقوی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> ''محترم غلام الثقلین نقوی کا ''رابطے'' بہ تہی دلکش اور دلچسپ ہے۔ یہ ہماری تاریخ کے ایک بہت اہم دور کی یادگار ہے۔ اس آئینے میں ہم اپنے دورِ غلامی کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور اپنے فکری اور جذباتی خدوخال کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ باتیں شاید کسی مؤرخ نے نہیں لکھی ہوں گی مگر یہ باتیں تاریخ کا کتنا لازمی اور کتنا سچا جزو ہیں۔ مؤرخ تو صرف خارجی واقعات کو قلم بند کرتا ہے لیکن اصل واقعات تو ہمارے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں جہاں تک مؤرخ کی آنکھ نہیں جاتی۔'' ۲۸

اُردو ادب میں دبستانوں کی تفریق امتیازی حیثیت رکھتی ہے مثلاً دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ رام پور وغیرہ۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بحث ''اوراق'' کی زینت بنی، کیا لاہور ایک دبستان ہے۔ اس سلسلہ میں رَدوکد کی گئی اور دبستان کی معنویت

اور مزاج کے تعین کی کوشش کی گئی۔ اکبر حمیدی نے ''دبستانِ لاہور'' کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''دبستانِ لاہور کی بحث میں بعض حضرات نے لاہور کو دبستان تو قرار دیا ہے مگر اس کی وہ معنوی اور صوری خصوصیات بیان نہیں کیں جن کی بنا پر ہم لاہور ادب کو کراچی، پشاور یا کوئٹہ کے ادب سے الگ کر سکیں اس طرح دبستانِ لاہور کا کوئی بھی تشخص اُبھر کر سامنے نہیں آیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر لاہور دبستان ہے تو اس کا تشخص کیا ہے؟ جس طرح ہم لکھنؤ، دلی اور رام پور دبستان کے نمایندہ شعراء کو پہچان سکتے ہیں کیا لاہور دبستان کے شعراء کو ہم کسی بنیاد یا تشخص کی بنا پر دوسرے شعراء سے الگ کر سکتے ہیں؟ دبستان سے مراد اگر پورا پنجاب بھی ہو تو بھی میرے خیال میں اس کی کوئی الگ شکل وصورت نہیں بنتی۔ زبان، اسلوب اور مضامین مختلف شعرا کے مختلف ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ ایک شہر یا ایک صوبے میں رہنے والے شعراء کے ہاں بھی زبان اسلوب اور مضامین مختلف ہو سکتے ہیں۔ اصل میں کسی شہر یا علاقے کا دبستان قرار پانا آج سے سو دو سو سال پہلے کی باتیں ہیں۔ جب رسل ورسائل اور پریس کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ میل جول کے مواقع بہت کم تھے، بڑے بڑے شہر دوسرے شہروں کی ثقافت سے الگ تھلگ ایک جزیرے کی طرح زندگی کرتے تھے۔ کوئی بھی دوسرے پر اثر انداز ہونے کے ذرائع نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ ہر ادبی مرکز اپنے آپ میں سمٹ کر اپنے تشخص کو بحال رکھے ہوئے ایک مخصوص مقامی رنگ میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہی حال اُس کے ادب کا تھا جو نہ تو کسی سے متاثر ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی کو متاثر کر رہا تھا۔ اس طرح اس کی کچھ اپنی خصوصیت اور پہچان بن گئی تھی۔ آج تو ذرائع ابلاغ اور رسل ورسائل کے وسائل کی کثرت نے سارے پاکستان کے ادب کو یک جان کر دیا ہے۔ اب کسی بھی شہر یا علاقے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے تشخص کو دوسروں کے اثرات سے بچا سکے۔ ادبی رسائل، اخبارات، ریڈیو، ٹی وی نے سارے پاکستان کو ادبی سطح پر ایک شہر بنا دیا ہے۔ اس لیے موجودہ صورتِ حال میں کسی دبستان کا تصور قائم کرنا بہت محال ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ پاک بھارت کے ادب کو بھی ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنا مشکل نظر آرہا ہے اور شاید ہی دونوں کو الگ دبستان قرار دیا جا سکے۔ آج کی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے۔ امیر آدمی کہیں بھی ہے اس کا طرزِ زندگی ایک ہے۔ میرے خیال میں دبستان کی بنیاد ہمارے زمانے میں نظریاتی سطح پر رکھی جا سکتی ہے مگر کسی جغرافیائی دبستان کا تصور قائم کرنا شاید اب ممکن نہیں!!''۲۹

اکبر حمیدی کے خطوط میں تنقید کے اعلیٰ نمونے اس امر کے مظہر ہیں کہ اُن کی تنقید بے لاگ اور مبنی بر حقیقت ہے۔ شعری ذوق جبلی ہے۔ افسانے اور انشائیے کے خدوخال کے تعین میں ڈاکٹر وزیر آغا کی فکر کی تائید و تقلید حمیدی کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ دبستانِ لاہور کی اصطلاح کے بارے میں اُن کی رائے جچی تُلی اور معتبر قرار دی جاتی ہے۔ شعری اصناف، غزل، نظم، نثری نظم میں انھوں نے خود بھی طبع آزمائی کی اور تنقید میں سمت نمائی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ الغرض اُن کی سب کاوشیں نظم و نثر کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس لیے مجلہ ''اوراق'' کے حوالے سے اکبر حمیدی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

حواشی

۱۔ اکبر حمیدی، مکتوب بنام مدیر "اوراق"، شمارہ نمبر ا، دورِ ثانی، مارچ/اپریل ۱۹۷۲ء
۲۔ ایضاً، شمارہ خاص، نومبر/دسمبر ۱۹۷۴ء
۳۔ ایضاً، سالنامہ اپریل/مئی ۱۹۷۵ء
۴۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، جنوری/فروری ۱۹۷۸ء
۵۔ ایضاً، شمارہ خاص، ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۰ء
۶۔ ایضاً، سالنامہ اپریل/مئی ۱۹۷۵ء
۷۔ ایضاً
۸۔ ایضاً، شمارہ خاص، ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۰ء
۹۔ ایضاً، شمارہ خاص، فروری/مارچ، ۱۹۸۱ء
۱۰۔ ایضاً، شمارہ، ستمبر/اکتوبر، ۱۹۸۱ء
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، نومبر/دسمبر، ۱۹۸۳ء
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، جولائی/اگست، ۱۹۸۴ء
۱۵۔ ایضاً، سالنامہ، اکتوبر/نومبر، ۱۹۸۵ء
۱۶۔ ایضاً
۱۷۔ ایضاً، سالنامہ اکتوبر/نومبر ۱۹۸۶ء
۱۸۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، اگست ۱۹۹۰ء
۱۹۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، جون/جولائی ۱۹۹۱ء
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، جولائی/اگست ۱۹۹۸ء
۲۲۔ ایضاً
۲۳۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، مارچ/اپریل، ۲۰۰۴ء
۲۴۔ ایضاً، سالنامہ، جنوری/فروری، ۱۹۹۹ء
۲۵۔ ایضاً، بہار نمبر، اپریل/مئی، ۱۹۸۲ء

۲۶۔ ایضاً، شمارہ بہار نمبر، اپریل/مئی ۱۹۸۲ء

۲۷۔ ایضاً، سالنامہ نومبر/دسمبر ۱۹۸۲ء

۲۸۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، نومبر/دسمبر ۱۹۸۴ء

۲۹۔ ایضاً، شمارہ خاص نمبر، جون/جولائی ۱۹۸۸ء

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

سہ ماہی ''**اوراق**''، لاہور۔ مارچ/اپریل ۱۹۷۲ء، نومبر/دسمبر ۱۹۷۴ء، اپریل/مئی ۱۹۷۵ء، جنوری/فروری ۱۹۷۸ء، ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۰ء، فروری/مارچ، ۱۹۸۱ء، ستمبر/اکتوبر، ۱۹۸۱ء، اپریل/مئی، ۱۹۸۲ء، نومبر/دسمبر ۱۹۸۲ء، نومبر/دسمبر، ۱۹۸۳ء، جولائی/اگست، ۱۹۸۴ء، نومبر/دسمبر ۱۹۸۴ء، اکتوبر/نومبر، ۱۹۸۵ء، اکتوبر/نومبر ۱۹۸۶ء، جون/جولائی ۱۹۸۸ء، اگست ۱۹۹۰ء، جون/جولائی ۱۹۹۱ء، جولائی/اگست ۱۹۹۸ء، جنوری/فروری، ۱۹۹۹ء، مارچ/اپریل، ۲۰۰۴ء